رئیس احمد جعفری

میرِ کارواں

"وہ جس کی یاد، دل سے بھلائی نہ جائے گی"

۱۹۵۳ء میں خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کے بھائی خواجہ عبدالغنی صاحب کے مکان پر کراچی میں ہوئی۔ وہ حجازِ مقدس سے واپس تشریف لائے تھے اور اپنے ساتھ ابن سعود کے دیئے ہوئے تحائف کا ایک انبار بھی لائے تھے۔ مرصع خنجر، زرکار عبا، مطلا عقال اور بہت سی دوسری چیزیں۔ یہ سب چیزیں میز پر رکھی تھیں۔ وہ اپنے ملنے والوں کو تاثراتِ سفر کے ساتھ ساتھ ان چیزوں سے بھی متعارف کراتے جاتے تھے۔ کوئی نصف گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر لوگ منتشر ہونا شروع ہو گئے۔ اب خلیفہ صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی۔ میری دو کتابیں "دید و شنید" اور "تاریخ تصوف اسلام" کا وہ مطالعہ کر چکے تھے۔ کچھ دیر ان پر گفتگو رہی۔ میں نے اپنی ایک اور کتاب "روایاتِ اغانی" کا ذکر کیا۔ جسے انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) نے شائع کیا تھا۔ اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ دوسرے دن وہ کتاب میں نے انہیں بھجوا دی۔ کچھ عرصہ بعد وہ پھر کراچی تشریف لائے۔ کتب خانہ تاج آفس کا میں نگراں تھا۔ وہاں پہنچے مگر اتفاق سے میں موجود نہ تھا۔ کارڈ چھوڑ آئے۔ دوسرے دن میں غنی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ بہت تپاک اور گرم جوشی سے ملے اور بغیر کسی تمہید کے مجھے ادارہ ثقافت اسلامیہ کا فیلو بننے کی دعوت دی۔ بعض وجوہ سے میں کراچی کی اقامت ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ازراہ عنایت انہوں نے یہ منظور کر لیا کہ کراچی میں رہ کر میں ادارہ کے لیے ایک کتاب لکھوں، جس کا معقول معاوضہ وہ دیں گے۔ میں نے یہ پیش کش منظور کر لی۔ "اسلام اور روادی" کے نام سے ایک کتاب کا آغاز کر دیا۔ جتنا حصہ ہوتا جاتا تھا وہ بذریعہ ڈاک بھیجتا جاتا تھا۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں کتاب ختم ہو گئی۔ میں ایک کام سے لاہور آیا۔ معاوضہ وصول کرنے دفتر پہنچا۔ جس کی ادائیگی کا انہوں نے فوراً حکم صادر فرما دیا اور پھر اپنی پیش کش دہرائی۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

ادارہ میں شریک ہونے کے بعد مجھے خلیفہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ادارہ میں آنے سے پہلے میں ان کی قابلیت سے مرعوب تھا۔ یہاں آکر ان کی انسانیت نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ بہت بڑے فلسفی تھے۔ بہت بڑے مفکر تھے۔ بہت بڑے انشاپرداز تھے۔ علم کلام کے رمز آشنا، تصوفِ اسلامی کے پرستار، اقبالیات کے ماہر، حافظ کے معتقد، مثنوی کے شارح، نقاد، بذلہ سنج، سخن فہم، نکتہ بیں اور نہ جانے کیا کیا؟ لیکن ان تمام چیزوں میں وہ یکتا

نہ تھے۔ فلسفی اور بھی تھے۔ انشا پردازوں کی کمی بھی نہ تھی۔ اقبالیات سے شغف رکھنے والے بھی کافی تھے۔ مثنوی کی ترجمانی بھی بڑی قابلیت کے ساتھ کئی لوگ کر چکے تھے۔ بےشک ان چیزوں میں خلیفہ صاحب درجۂ اختصاص پر فائز تھے لیکن منفرد نہ تھے۔ جس بات میں ان کو میں نے منفرد پایا وہ تھا ان کا مقامِ انسانیت۔

ہم لوگوں میں وہ اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ کسی طرح کا امتیاز و تفوق اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ پندار اور نخوت کا مظاہرہ اگر کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات ان کی فطرت سے بعید تھی۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنی کہتے تھے اور کہتے رہتے تھے لیکن دوسرے کی بھی سنتے تھے، اور اگر بات سمجھ میں آجاتی تو مان بھی لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، ادارہ کے لان پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سردی کا موسم تھا۔ دھوپ میں مجلس جمی اور باتیں شروع ہوگئیں۔ مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ کچھ سوچتے ہوئے خلیفہ صاحب نے کہا:

"شراب کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے، آدمی بہک جاتا ہے۔ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے لیکن اگر شراب اتنی پی جائے کہ نشہ نہ ہو تب تو شراب حرام نہیں ہونی چاہیئے۔" انہوں نے چاہا اس پر تحقیق کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا امام محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر نشہ نہ ہو تو پھر حرام نہیں ہے (غیر خمر)

یہ سن کر خلیفہ صاحب خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا یہ امام محمد کا فتویٰ نہیں قول ہے اور مفتی بہ نہیں ہے۔

بشیر احمد صاحب ڈار میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا مفتیٰ بہ کی تعریف کیجئے۔ میں نے عرض کیا، امام ابو حنیفہ کی مجلس میں ان کے کبار تلامذہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر وغیرہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اپنی بصیرت کے مطابق اظہار کرتا تھا۔ پھر بحث و مباحثہ کے بعد ایک قول پر یا اتفاق آرا ہو جاتا تھا یا کثرت رائے۔ دونوں صورتوں میں یہ آخری قول مفتیٰ بہ مانا جاتا ہے اور فقہائے امت اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ دوسرے اقوال ساقط ہو جاتے ہیں۔ ان سے حجت اور سند نہیں لائی جاتی۔

یہ سن کر خلیفہ صاحب خاموش ہو گئے اور پھر کبھی اس مسئلہ کو انہوں نے موضوع بحث نہیں بنایا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، حکومت کے قائم کردہ میرج کمیشن کا اجلاس اس ادارہ میں ہو رہا تھا۔ سر عبدالرشید صدر تھے خلیفہ صاحب سیکریٹری۔ بیگم شاہنواز اور بیگم جی احمد بھی ممبر کی حیثیت سے شریک مجلس تھیں۔ کبھی کبھی خلیفہ صاحب ہم لوگوں کو بھی شریک بحث کر لیا کرتے تھے۔ اس روز بھی ہم سب موجود تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ اسلام میں یہ جائز ہے کہ ایک مسلمان کسی کتابی عورت سے شادی کر لے۔ لیکن کوئی مسلمان عورت کسی کتابی مرد سے نکاح نہیں کر سکتی ـــــ کیوں؟

کسی صاحب نے بتایا قرآن میں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا۔ اسلام نے جو حقوق عورتوں کو دیئے ہیں ایک عیسائی یا یہودی کی عورت مسلمان کی بیوی بن کر وہ سب حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ایک مسلمان عورت کسی عیسائی یا یہودی سے شادی کر لے تو وہ ان تمام حقوق سے محروم ہو جائے گی۔ گویا دوسرے الفاظ میں ایک کتابی عورت مسلمان کے گھر میں آکر وہ سب کچھ پا لیتی ہے جو اس کا مذہب اسے نہیں دے سکتا تھا۔ اور ایک مسلمان عورت یہودی یا عیسائی کے گھر میں جاکر ان تمام حقوق و مراعات سے محروم ہو جاتی ہے جو اسلام نے اسے دیئے تھے۔ کیا یہ کوئی معمولی فرق ہے؟

اس جواب نے فضا بدل دی۔

خلیفہ صاحب کو اکثر غیر ممالک سے لیکچر دینے کی دعوتیں ملتی رہتی تھیں اور وہ انہیں قبول بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ سے واپسی پر لندن ٹھہرے۔ وہاں نہ جانے کیا جی میں آئی کہ وطن واپس آنے کے بجائے اسپین چلے گئے۔ جہاں جاکر اقبال نے کہا تھا:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال　　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

خلیفہ صاحب نے اس دیس کی خوب سیر کی۔ قرطبہ دیکھا، غرناطہ گئے۔ الحمرا کی زیارت کی، جامع قرطبہ میں نماز پڑھی۔ وہاں سے ایک خط رفقائے ادارہ کے نام لکھا جس میں اپنی اس سیاحت کا چند سطروں میں ذکر کرنے کے بعد لکھا،

ابھی اس انداز سے کوئی گیا ہے　　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ان چند الفاظ میں خلیفہ صاحب نے پورا سفر نامہ لکھ ڈالا ——— جذبات سے بھرپور۔

اپنے نجی ملازمین کے ساتھ یا دفتر کے چپڑاسیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بے انتہا شفقت اور عنایت کا تھا۔ عام طور پر صبح اٹھنے کے بعد اپنی کوٹھی کے لان میں آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہیں اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ ملازم کو ہر روز ان کے بیدار ہونے سے پہلے کرسی لے جاکر وہاں بچھانی پڑتی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب اسے برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے لکڑی کے چند تختے ایک بنچ کی طرح بنوا کر وہاں رکھ دیئے تاکہ کرسی لانے اور لے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ آئے اور بیٹھ گئے۔

دفتر کا ایک ملازم حمید اللہ چونکہ مہاجر تھا لہذا اسے رہنے کے لیے انہوں نے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ اس کی بیوی بیمار پڑی تو جو کچھ ہو سکا کیا۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ خلیفہ صاحب نہ صرف خود دھوپ کی تیزی اور شدت کے باوجود نماز جنازہ میں شریک ہوئے بلکہ رفقائے ادارہ کو بھی دعوت دی کہ جو چلنا چاہے چلے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل انسانی ہمدردی سے کتنا معمور تھا۔

خلیفہ صاحب کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی صاحبزادی ایم۔ اے ہیں۔ تکمیل تعلیم کے لیے امریکہ بھی جا چکی ہیں۔ فلسفہ سے دلچسپی وراثت میں پائی ہے۔ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ جانے لگے تو فرمایا، اس بہانے عارف سے ملاقات ہو جائے گی، بہت دنوں سے اسے نہیں دیکھا ہے۔ واپس آئے تو ایک موٹر اپنے ساتھ لائے۔ کہنے لگے روپے کم پڑ گئے تھے۔ عارف نے جو کچھ جمع کیا تھا سامنے رکھ دیا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ عارف صاحب امریکہ سے واپس آجائیں اور یہیں رہیں۔ باپ کی آنکھوں کے سامنے۔ ماں کی آغوش محبت میں لیکن انہوں نے کبھی اصرار نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے عارف صاحب خود ہی فیصلہ کریں۔ اپنا فیصلہ ان پر عائد کرنا منظور نہ تھا

بزرگوں سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت غوث شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے۔ تذکرہ غوثیہ کے اکثر واقعات جو حضرت صاحب کی کرامات اور خرق عادات پر مبنی تھے جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں کوئی مجذوب تھے ان سے بھی بہت متاثر تھے۔ مری جاتے آتے وقت اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے کشف و کرامت کے واقعات بیان کرتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے میں اپنی لڑکی کے ساتھ ملنے گیا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی انہوں نے مسکرا کر فرمایا اس کی شادی اس کی موسی کے لڑکے سے ہو رہی ہے۔ اچھا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے تھے یہ بات سن کر میں بہت متعجب ہوا کیونکہ واقعی اس کی شادی اس کے خالہ زاد بھائی سے طے ہو چکی تھی۔ اپنی ایک اور عزیزہ کا قصہ بیان کرتے تھے کہ ان کے شوہر نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ناکام ہوئے، وہ ان مجذوب صاحب کے پاس پہنچیں۔ دیکھتے ہی آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا، "دروازے بند ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

خلیفہ صاحب کو اردو زبان سے اتنا شغف تھا کہ ان کے گھر کی زبان اردو ہی تھی۔ ایک مرتبہ غالباً ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں اور حنیف صاحب مری گئے۔ خلیفہ صاحب نے ایک بنگلہ کرایہ پر لے رکھا تھا جہاں اپنی بیگم اور صاحبزادی کے ساتھ مقیم تھے۔ قریب ہی ہوٹل سنٹرل تھا جہاں ہم دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سہ پہر کو دوسرے تیسرے دن وہاں چلے جاتے ایک دفعہ ہم لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ان کی ننھی سی نواسی کھیلتی ہوئی آئی۔ خلیفہ صاحب نے اسے گود میں لے لیا اور چائے پلانے لگے۔ پھر فرمایا آج اس کی آیا کی شامت آگئی تھی۔ قریب تھا کہ اس کی ماں اسے نکال دیتی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا آج اس لڑکی کے منہ سے پنجابی کا ایک لفظ نکل گیا تھا جس سے اس کی ماں برافروختہ ہو گئی کہ یہ آیا تو بچی کی زبان بگاڑ دے گی۔

بہت سی باتیں ہیں لیکن اس مختصر سی مجلس میں تفصیل کا موقع کہاں؟

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لیے